ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.3,Issue No.3(2021)
(July to September)

احمد مشتاق کی غزل اور عوامی معاشرتی رویے

Ahmad Mushtaq's Ghazal and Public Social Behaviour

مطلوب حسین
لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، ساہیوال
ماجد مشتاق
لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract:

Ahmed Mushtaq is considered as one of the representative poets of modern Urdu ghazal. The main themes of his ghazal include love, beloved and migration and extinction. He consistently presents social norms in his poetry along with other subjects. He is fully aware that the people of his homeland are not living a prosperous life. In this regard, he blames the attitudes of the people. He thinks that those who cannot distinguish between good and evil can never progress. Mushtaq's poetic tone is sympathetic instead of satirical. That is why his words reach the heart of the reader. Ahmed Mushtaq's style and presentation is very simple and smooth so he can easily have conveyed his feelings to others. Undoubtedly, his ghazal is a true reflection of Pakistani society

Key words: beloved, migration, extinction, social norms, sympathetic, feelings

تقسیم ہندوستان ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ جس کے اثرات زندگی کے ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنی روح تک اترتے محسوس کیے۔ ایک طرف دیرینہ خواب کی تکمیل کا جشن منایا جارہا تھا تو دوسری جانب صدیوں سے مل جل کر رہتے چلے آتے جان سے پیارے لوگوں سے جدا ہونے کا غم روح کو افسردہ اور قلب کو مغموم کر رہا تھا۔ اس خوشی و غم کی باہم ملی جلی کیفیت کو وہ ہی جان اور سمجھ سکتا ہے کہ جو لیلائے وطن کے لیے اپنی سبھی محبتوں، قول و قرار، خواب اور تنکا تنکا جوڑ کر بسائے گئے گھر آنگن چھوڑ کر نئے وطن کی محبت میں بے گھر، بے در اور بے یار مددگار ہوا ہو کہ میوا کی لذت میوا چکھنے اور آگ کی جلن بدن جلنے اور آبلوں کی روح تک گھائل کر دینی والی ٹیسوں کو سہنے والا ہی جان سکتا ہے۔

اردو اور ہندی و پاک علاقائی ادب نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا بلکہ ادب اور ادیبوں کو ایک ایسا موضوع ہاتھ لگ گیا کہ جس کے عملی تجربے سے کسی نہ کسی طرح وہ خود وابستہ تھے تو دوسرا یہ قارئین و سامعین کی ایسی دکھتی رگ تھی کہ جس کو چھیڑتے ہی وہ لذت و درد کی ملی جلی کیفیات سے اچھل اچھل جاتے۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح شاعری خصوصاً غزل میں بھی اس واقعے کو تواتر، تسلسل اور جذباتی آہنگ میں خوب مزے لے لے کر مختلف مضامین کی صورت پیش کیا گیا۔ اگرچہ بعض شعرا مبالغہ آمیزی میں اس قدر بڑھ گئے کہ جذبہ صدق کے اظہار کی بجائے سستی اور وقتی جذباتیت کو اپنی جھولی میں بھر کر اول فول کہنے کو اپنے فن کا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ گو کہ ایسے شعراء کو وقتی طور پر یقیناً اچھی پذیرائی ملی لیکن کچھ عرصے بعد وہ رستے کی گرد کی طرح ایسے بیٹھے کہ منظر سے ہی غائب ہو گئے۔ ایسی دلچسپ صورتحال نے اردو غزل کو چند ایسے شاعر بھی عطا کیے جو آنے والوں زمانوں میں اردو شاعری کی آبرو اور معتبر حوالہ ٹھہرے۔ اگر ہم ان میں سے چند ناموں کا ذکر کریں تو ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، اسلم انصاری اور انجم رومانی کو اس فہرست میں ضرور شامل کرنا ہو گا۔ متذکرہ شعراء نے ایک طرف تقسیم، ہجرت اور فسادات کی حقیقی تصاویر کو اپنی غزل کا موضوع بنایا تو دوسری طرف انہوں نے غزل کے بنیادی لوازمات کو بھی ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کیا۔ نتیجتاً یہ نہ صرف اپنے عہد کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ بعد میں آنے والا ہر دور ان سے

فیض حاصل کرتا اور ان کے فن کا سکہ مانتا کسی نہ کسی رنگ میں ان کی پیروی کرتا چلا آرہا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کی غزل کو جس شاعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ احمد مشتاق ہے۔ اس اعزاز کے پیچھے دو محرکات کار فرما ہیں، ایک تو وہ پختہ کار اور خداداد شاعر ہیں کہ یہ ملکہ انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا اور دوسرا سبب بھی خداداد ہے یعنی ان کی طویل العمری۔ اگرچہ وہ عین جوانی میں ہی پاکستان چھوڑ کر امریکہ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پاکستانی اردو غزل کے مرکزی دائرے سے پوری طرح وابستہ اور جڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل پردیس میں رہتے ہوئے بھی دیس کے باسیوں کے تصورات، مسائل، عقائد اور رسم ورواج کی مکمل ترجمان بن کر ابھرتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی الجھنوں اور معاشرتی نہ ہمواریوں کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

مشتاق جب اپنے وطن اور ہم وطنوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو خاصے فکر مند ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ بات رہ رہ کر ستاتی اور غمزدہ کرتی ہے کہ اس ملک کو حاصل کرتے ہوئے کیسے کیسے خواب بنے گئے تھے، کیا کیا خواہشات من میں پالیں گئیں تھیں۔ کیسی مثالی قربانیاں دیں گئیں تھیں۔ عزتوں کے جنازے نکلتے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی صبر وشکر کو سینے سے لگائے یہ سوچا گیا تھا کہ بہت جلد اچھے اور آزادی کے دن آنے والے ہیں۔ ایسے دن کہ جب کسی غریب اور امیر کی زندگی اور رہن سہن میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ جب سب یکساں اور برابری کی سطح پر مہر ومحبت سے پر سکون اور مطمئن ہوں گے۔

لیکن نہ جانے ان خوابوں کو کس بد نظر کی بد نظری کھا گئی، کچھ بھی تو ویسا نہیں جس کی خواہش لیے تن من دھن نچھاور کر دیے گئے تھے۔ ایک مخصوص قسم کی نفسا نفسی وطن عزیز کے ہر شہری کی زندگی کا حصہ بن کر جذبہ محبت اور احساس کو پتھر کرنے کا موجب بن چکی ہے۔ وطن عزیز کا ہر فرد اور شہری ایک دوسرے کے معاملات سے اجنبیوں سے بھی بڑھ کر بیگانہ اور بے تعلق نظر آتا ہے۔ نہ جانے حسد اور جلن کی کیسی آگ جلی ہے کہ اس کے زہریلے دھویں نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دلوں سے مروت اور احترام کے جذبات لے کر ایک دوسرے کے لیے جلن اور نفرت بھر دی گئی ہو۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا ملک بے راہروی کا مطیع بن کر ایک ایسے مرض کا شکار بن گیا ہے جو لاعلاج ہے اور جس کی تاثیر گھن کی طرح چاٹ جانے والی ہے۔

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے (۱)

مشتاق کی سرشت وفا کی مٹی سے ترتیب دی گئی ہے۔ اسی سبب تو وہ دور دیس میں رہنے کے باوجود اپنی دھرتی کی محبت سے سرشار رہتے ہیں۔ ان کی آنکھ اپنے محبوب وطن کی گلیوں، بازاروں اور ہر ماحول ومنظر کو غائبانہ طور پر دیکھتی اور ان کا دل اپنے سابقہ وطن کے باسیوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں پاکستانی معاشرے کے ابتذال پر نہ صرف کڑھتے اور بے چینی کا شکار دکھائی دیتے ہیں، بلکہ ان کا مشاہدہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے کہ اگر معاشرتی بے ترتیبی کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو ملک ایک ایسی خزاں کی لپیٹ میں آجائے گا کہ جس سے نجات ہمارے بس میں ہی نہ رہے گی۔ وہ وطن کے کرتا دھرتا اور صاحب اختیار لوگوں کو التجایہ انداز میں کہتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے کہ اپنے رویوں، عادات اور ترجیحات کو بدل لو کہ ابھی شاید واپسی کی گنجائش باقی ہو، لیکن اگر یہ وقت بھی تم لوگوں نے ذات پرستی اور نجی تعیشات کی تکمیل میں بسر کر دیا تو شخصی واجتماعی زوال سے اس پاک وطن کو کوئی بھی نہ نکال پائے گا۔ ایسے اشعار میں مشتاق کا لب ولہجہ جس اخلاص سے لبریز ہوتا ہے وہ ان کے داخلی جذبات کا اعلان اور عکاس ہے۔ پروفیسر صباحت زہرا کے الفاظ میں:

> "اردو غزل کا غالب سرمایہ وصال کی نشاطیہ کیفیات اور فراق کی یاسیت بھری آہ سے لبریز ہے۔ مشتاق کے کلام کے سر تال بھی ایسے ہی مضامین سے عبارت ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ جہاں جمال یار کے قصیدہ خواں نظر آتے ہیں وہیں وطن کی محبت کے بھی بہی خواہ ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں نہ صرف معاشرتی زوال کا مشاہداتی اظہار کرتے ہیں، بلکہ ان الجھنوں، مسائل اور غیر متوازن رویوں کی اصلاح کے بھی خواہش مند ہیں جس نے ان کی شاعری کو وہ صداقت عطا کی ہے جو سیدھا دل میں اتر جاتی ہے۔" (۲)

اب کے اس باغ میں وہ رنگ خزاں دیکھو گے
نہ اڑے گا کوئی شعلہ نہ دھواں دیکھو گے
جیسے ممکن ہو بچالو یہ اجڑتے ہوئے شہر
پھر نہ یہ رنگ نہ چہرے نہ مکاں دیکھو گے (۳)

غزل کی صنف دوسری شعری اصناف کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور معنی آفرینی کے حوالے سے مشہور و معروف ہوتی جارہی ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات و اسباب گنوائے جاسکتے ہیں۔ انہی وجوہات میں سے ایک وجہ اس کا علامتی و استعاراتی نظام ہے۔ یہ علائم و رموز ایک طرف تو شعر میں اجنبیانے کی فضا کو جنم دے کر قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں تو دوسری طرف عام اور سادہ و روزمرہ کا موضوع بھی ان کے استعمال سے نیا، دلفریب، اچھوتا اور پرکشش بن کر اپنے سامعین و قارئین کو جھومنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مشتاق نے بھی اپنے اشعار میں ایسی صنعتوں کا بھرپور اور برمحل استعمال کیا ہے۔ دیکھیے کس کمال خوبی سے گزشتہ وطن کے لوگوں اور ان کے رویوں کے نتیجے کے طور پر خدائی نعمتوں کے منہ موڑ جانے کا ذکر کرتے ہیں کہ جس میں اس صورت حال کا افسوس کرنے کے ساتھ اس بات کا بھی احساس صاف طور پر جھلکتا ہے کہ اگر یہاں کے باشندوں کے مزاجوں میں مثبت تبدیلی نہ آئی تو ایسی بستی میں بھلا کس طرح گزارہ ممکن ہو سکتا ہے۔ شاید مشتاق کی پاکستان سے امریکہ کو کی جانے والی ہجرت انہیں معاشرتی رجحانات کا ردعمل تھی۔

کیسے اس ہجر کی بستی میں گزارہ ہو گا
پانی اچھا ہے یہاں کا نہ ہوا اچھی ہے (۴)

ایک ماہر فن کار یہ مہارت رکھتا ہے کہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ یہ ہنر کاری جس ہنر کار میں جس قدر جتنی زیادہ ہو گی اسی قدر وہ دیگر ہم پیشہ لوگوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مشتاق کا کلیات اور شعری مجموعے اوراق خزانی میں ایسے سینکڑوں اشعار سرسری مطالعہ سے دستیاب ہو جاتے ہیں کہ جن میں شاعر نے اپنے زور کلام سے ان بے زبانوں کو قوت گویائی اور شعور کی اعلیٰ منازل پر پہنچا دیا ہے۔ یوں ان کے اشعار میں قاری کے لیے حیرتوں کا ایک ایسا سلسلہ تشکیل پا جاتا ہے جس کی دوسری جانب ادراک کی قوس قزاح کے رنگ قاری کو خوش آمدید کہنے اور ان کے بغل گیر ہونے کے لیے بازو پھیلائے ملتے ہیں۔ مشتاق کا کمال یہ ہے کہ وہ فرضی فضا اور ماحول بنا کر اس میں ایسا کھو سا جاتے ہیں کہ پھر وہ ہی ان کے لیے حقیقت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کو ہم ان کی قوت متخیلہ کی استعداد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں کہ جس میں معاشرتی عدم استحکام کے منفی نتائج ثابت کرنے کے لیے اپنے وطن کی گلیوں کو حالات کے پیش نظر چپ، نگر، دیوار و در، کووں اور چڑیوں کو احتجاجاً اور ایک محسوس کر لیے گئے خوف کے زیر اثر نہ بولنے والا دکھا کر حالات حاضرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے، جس میں وہ پوری طرح کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

گلیوں کو چپ لگی ہے نگر بولتے نہیں
دیوار و دَر وہی ہیں مگر بولتے نہیں
کوے کہاں چلے گئے چڑیوں کو کیا ہوا
جو بولتے تھے شام و سحر بولتے نہیں (۵)

ٹاسٹلجیا یا اپنے ماضی سے بے پناہ محبت مشتاق کی غزلیات کا کلیدی محرک اور مضمون رہا ہے۔ وہ بے فکری اور خوشحالی کے دنوں میں بھی اپنے عہد رفتہ کو نہیں بھلا پائے۔ اگرچہ انہیں اس امر کا پورا پورا اندازہ ہے کہ جس کٹھن دور سے ملک اس وقت گزر رہا ہے اور معاشرہ جس سرعت رفتاری سے اپنے اسلاف کی اقدار کو ملیامیٹ کرنے پر لگا ہوا ہے، کچھ بھی تو ایسا نہیں بچا ہو گا کہ جس کو دیکھ کر وہ اپنے تشنہ دل کی پیاس بجھا سکیں۔ باوجود اس کے، وہ اپنے شہر کی بعض چیزوں کو بھلانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے لاشعور میں وہ گھر، جالیاں اور شیشے آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں جہاں ان کی محبوب شخصیت رہا کرتی تھی۔ جس کے حسن نے ان کی شاعری کو وہ جمالیاتی رنگ عطا کیے ہیں کہ جس کے سبب ان کی غزل کا قاری اپنی رگ رگ میں ایک خمار اترتا محسوس کرتا ہے۔

شہر تو کب کا مٹ چکا لیکن اب تک یاد ہیں
کسی مکاں کی جالیاں شیشے کسی مکان کے (۶)

قسام ازل نے کائنات کے جزو کل میں کوئی شے ایسی نہیں بنائی جو لایعنی اور بے مقصد ہو۔ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہماری کم علمی اور کوتاہ بینی چیزوں کی ماہیت و مقاصد کو نہ سمجھ سکے۔ شعرا چوں کہ طبعاً حساس، باریک بیں اور قدرتی مشاہداتی ملکہ رکھتے ہیں اس لیے ان کا اشیاء و عوامل کے بارے میں سوچنے اور جانچنے کا انداز عام انسانوں کی نسبت مختلف ہوتا ہے۔لہذا وہ قدرت الٰہی کے شہکاروں کو پرکھنے اور جاننے کی استعداد بھی قدرے زیادہ رکھتے ہیں۔

احمد مشتاق کو ہی لیجیے وہ معاشرتی اتار چڑھاؤ سے یہ جان چکے ہیں کہ اگر معاشرتی بے ترتیبی کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو پھر اس معاشرے کو تباہ و برباد ہونے سے کوئی بھی دنیاوی طاقت نہیں بچا سکتی۔اسی سبب وہ وطن عزیز کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر انہیں نصیحت آمیز رنگ میں باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے دیس کی خزاں کو بھی قیمتی جانو کہ تمہارے نامہ اعمال اس بات پر دلالت ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب بے حس اور خود غرض رویوں کے نتیجے میں یہ باغ جنت جیسا ملک ویرانے کا نقشہ پیش کرنے لگے گا۔تب اہل وطن کو احساس ہو گا کہ اپنے وطن کی خزاں بھی پرائی بہار سے ہزار درجے بہتر تھی۔مشتاق نے ایسے مضامین کو ایک ماہر مشاق کی طرح خالص شاعرانہ لباس عطا کیا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے وہ جذبات اور جذباتیت کے ضبط کے شاعر ہوں۔انتظار حسین ان کی اس خوبی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس کم ظرف زمانے میں مشتاق کی طاقت یہ ہے کہ اسے اپنے آپ کو تھام کر رکھنا آتا ہے۔جذبے کو سنبھالنا، تخلیقی طور پر اس کی پرورش کرنا، تہذیب کرنا اسے خوب آتا ہے۔سو اس کے یہاں زور جذبے کے اعلان پر نہیں بلکہ جذبے کے ضبط پر ہے۔جذباتیت کے آس دور میں مشتاق کی غزل جذبے کی شاعری کی مثال پیش کرتی ہے۔خالص جذبے کی شاعری۔ کہہ لیجیے خالص شاعری۔"(۷)

ہاں رنگ خزاں کو بھی ترس جائیں گی آنکھیں
ہاں اہل چمن اب یہاں ویرانہ بنے گا(۸)

ایک عاقل انسان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ نہ وہ کرایے کے کانوں سے سنتا ہے اور نہ ہی پرائے دماغ سے سوچیں مستعار لیتا ہے۔وہ نظریہ پرست ہونے کی بجائے نظریہ ساز ہوتا ہے۔یہ خوبی اسے باشعور تو بناتی ہی ہے لیکن اسے آگاہی کے کرب سے بھی دوچار کرتی ہے۔احمد مشتاق کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ دیکھنے میں آتا ہے۔وہ مصنوعی شہرت اور غیر صحت مندانہ دکھاوے سے دور بھاگنے والے سچے، کھرے اور دوٹوک انسان ہیں۔جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہونے کے باوجود مشاعروں اور میڈیائی شہرت سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ان کا کھرا اور سچا لب ولہجہ بسا اوقات قارئین و سامعین کو کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے لیکن وہ اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے اور جو کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہہ کر ہی دم لیتے ہیں۔

وہ پاکستانی تہذیب و معاشرت کی عجیب و غریب کیفیات دیکھنے اور اس کی پسماندگی جاننے کے بعد ان لوگوں کے انداز فکر پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں جو ایسے حالات کو بھی بہار یا قرار سمجھ کر خود کو دھوکا دینے میں لگے ہوئے ہیں۔مشتاق، میر تقی میر کی طرح خطابیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کو نہایت ادب و احترام سے بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جنابِ من جن حالات اور تہذیبی و تمدنی زندگی کو تم لوگ بہار سے تعبیر کر رہے ہو یہ کسی صورت بھی بہار نہیں ہو سکتی۔تم لوگ اپنی خوش فہمی اور وہم کی دنیا سے حقیقی دنیا میں داخل ہو کر اپنے حالات کا ترقی یافتہ اقوام کے حالات سے موازنہ کرو تو تمہیں خود ہی سمجھ آجائے گا کہ تم محض خود کو دھوکا دے رہے تھے، ورنہ اصل حقائق تو اس کے برعکس ہیں۔

یہ جو بھی ہو بہار نہیں ہے جنابِ من
کس وہم میں ہیں دیکھنے والے پڑے ہوئے(۹)

مادہ پرستی انسان سے زندگی کے اصول اور جینے کا سلیقہ چھین لیتی ہے۔جو معاشرہ گنتی کے پھیر میں پڑ گیا سمجھو پھر اس کی معاشرتی اقدار اور ذہنی سکون کا تو جنازہ ہی نکل گیا۔یہ بیماری وہ لاعلاج مرض ہے جو کسی بھی قوم کے وقار اور بنیادوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر ریت کی بھربھری دیوار جیسا بنا دیتی ہے۔

مشتاق کو نہ صرف متذکرہ بات کا علم ہے بلکہ اسے اس امر کا بھی ادراک ہے کہ اس کے پاکستانی بھائی بندے اس حریصانہ لت کا شکار ہو کر خود پر ایسی ہوسناکی طاری کر چکے ہیں جس سے چھٹکارے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے مال و متاع کی غرض سے فطرت کے

حسین مناظر اور دلکش ماحول کو زہر آلودہ بنا اور تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ یوں غیر منظم اور فطرت مخالف انڈسٹری کو بغیر کسی دانائی یا منصوبہ بندی کے جہاں چاہا وہاں ٹھونس ٹھانس کر فضائی آلودگی اور زہریلے مادوں سے بھرے دھویں سے آسمان کی جذبیت و آفادیت کا تو گلا ہی گھونٹ دیا گیا ہے۔ اس پر انتہا کی بے وقوفی یہ کہ اس بیان کردہ صورت حال کا تریاق جن سبزہ زاروں اور فطرتی مناظر سے ممکن تھا انہیں بھی کاٹ کر کارخانے لگائے جا رہی ہیں۔ جو اور بھی باعث تشویش عمل ہے۔ ڈاکٹر ضیا فاطمہ کے بقول:

> "مشتاق چیزوں کو پاک و صاف دیکھنے کے قائل ہیں اور اسی لیے سائنسی و مشینی دور سے بے زار نظر آتے ہیں کیوں کہ ملوں اور کارخانوں کے دھوؤں سے زمین تو پہلے ہی گندی ہو چکی تھی اور اب یہ دھواں اور گندگی آسمان کو بھی میلا کر رہا ہے جس کی کسک ان کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔"(۱۰)

دھوئیں سے آسماں کا رنگ میلا ہوتا جاتا ہے
ہرے جنگل بدلتے جا رہے ہیں کارخانوں میں(۱۱)

مشتاق کے بعض اشعار تو ایسے حسبِ حال ہیں کہ شاعر کے متخیلہ کی طاقت پر حیرت کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ موجودہ عہد کی طرح ہر عہد میں سیاسی جماعتیں تبدیلی حالات، مسائل کے حل اور خوشحالی کے خواب دکھا کر عوام کو اپنا ہم خیال بناتی چلی آ رہی ہیں لیکن ملکی مسائل اور افراد کی زندگی پہلے سے بھی دشوار ہوتی جا رہی ہے۔ ہر بار عوام اس امید کے سہارے کہ اب کے معاشرتی حرماں نصیباں ضرور خوش بختی میں بدلیں گی کسی نہ کسی سیاسی جماعت کو اپنا رہنما مانتے ہوئے اسے اپنے ووٹ کے ذریعے حکومتی ایوانوں میں پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ترقی پذیر ممالک کی قسمت میں حالات کا بدلنا اور اچھے دنوں کا لطف شاید ہے ہی نہیں۔ لہٰذا حالات کی تبدیلی کے سبھی دعوے ہر دور حکومت میں سیاسی جماعتوں کے وعدوں اور پارٹی منشور کے اشتہاروں میں ہی دم توڑ جاتے ہیں۔ مشتاق نے اس حقیقت کو بڑے ہی سادہ، دوٹوک اور صاف ستھرے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ شعر حالات کے ستائے عوام کی آواز بن گیا ہے۔

تبدیلی حالات کے چرچے تو بہت ہیں
لیکن وہی حالات کی صورت ہے ابھی تک(۱۲)

ابن الوقت اور مفاد پرست عناصر کے ہاتھوں عام اور سادہ لوح انسانوں کی زندگی اجیرن اور مسلسل عذاب میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی سبھی نعمتیں اور سہولیات صرف اور صرف ان کے لیے عالم وجود میں آئی ہیں کسی دوسرے کا ان پر کوئی حق نہیں۔ وہ جیسے چاہیں ان کا استعمال یا ضیاع کریں کوئی بھی ان کو پوچھنے یا روکنے ٹوکنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

مشتاق کو اس طرح کے رویوں پر شدید اختلاف اور اعتراض ہے، کیوں کہ وہ اس مسلمہ حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ کوئی چاہے کتنا ہی اترا لے، دستبرد زمانہ سے بچ نہیں سکتا۔ موت اور فنا ایسے حقائق ہیں جو ایک چیتے کی مانند برق رفتاری سے سب کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے ہر لمحہ حرکت میں رہتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کتنے متکبر لوگوں کا غرور موت کے ہاتھوں منوں مٹی تلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دب گیا۔ کوئی انسان جتنا چاہے اس سے چھپ یا بھاگ لے وقت مقررہ سے ایک سیکنڈ بھی زیادہ جی نہیں سکتا۔

محفوظ دستبرد زمانہ سے کچھ نہیں
ہر شے کی گھات میں ہے یہ چیتا لگا ہوا(۱۳)

ذاتی حالات سے زیادہ معاشرتی ماحول انسانی نفسیات اور فطرت کی تشکیل کا موجب بنتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ عطار کی قربت بنا کچھ خرچ کیے ارد گرد والوں کے دل و دماغ خوشبو سے مہکا دیتی ہے اور لوہار کے پاس بیٹھنے والا بے شک لاکھ سنبھل اور سمٹ کے بیٹھنے کی کوشش کرے اس کا لباس کہیں نہ کہیں سے اس کی صحبت کا اعلان ضرور کرتا ہے۔

مشتاق کو بھی ماحول کے انسانی زندگی پر گہرے اثرات کا پورا پورا یقین ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کوئی شخص چاہے کیسا ہی پارسا بننے کی کوشش کرے وہ اپنے قرب و جوار سے یکسر نہیں بچ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہر شخص پر اس کی نفسیات اور فطرت کے سبب مختلف، کم یا زیادہ اثر پڑے۔ احمد مشتاق اس دعوے کی دلیل کے لیے دوسروں کی مثالوں سے کام نہیں چلاتے بلکہ اپنا کردار پیش کرتے ہوئے کہتے کہ جب میں اس دنیا میں آیا تھا اور مجھ پر

حرص و ہوس اور طمع نے اپنا جال نہیں ڈالا تھا تو میرے اعمال و افعال یہ ثابت کرتے تھے کہ میں بہت معصوم، اجلا اور شفاف ہوں۔ یہ احساس میرے لیے بڑا راحت بخش تھا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو مجھے بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑ گئے جس سے میرے دل اور روح کی شفافیت جاتی رہی اور جس کی جگہ دنیاداری اور طمع خام کے دھبوں نے لے کر میرا کردار مشکوک بنا دیا۔ مگر اپنی اس شخصی کمزوری پر اب سوائے کف افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس تناظر میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "احمد مشتاق کی شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ انہیں آدمی کے نجی منطقے، آدمی کی اپنی فرصت، اپنے اختیار کی حفاظت کی باقاعدہ فکر ہے۔ ان کی شاعری کا بہترین حصہ بھی شاید وہی ہے جو اس فکر کی پیداوار ہے۔ فکر کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ آدمی کے نجی منطقے میں باہر کی مداخلت مسلسل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی فکر کا صاف مطلب یہ ہے کہ باہر کی مداخلت کو روکنے کی تدبیریں سوچنا۔"(۱۴)

بہت شفاف تھے جب تک کہ مصروف تمنا تھے
مگر اس کار دنیا میں بڑے دھبے لگے ہم کو(۱۵)

قلب کا گداز ہونا گراں قدر نعمت سے کسی طور کم نہیں کہ ایسے ہی دلوں پر خدا کی محبت اور رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ جب کوئی معاشرہ فکر خلق خدا اور خوف خدا کو اپنی زندگیوں اور معاملات سے نکال دیتا ہے تو سمجھ لیں کہ اس کے برے دن شروع ہونے والے ہیں۔ یہ خود ستائی اور اپنی ذات کی پوجا پاٹ اس کی گمراہی اور تباہی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہے۔ لوگوں کا ایسا گروہ ایک مہذب معاشرہ کہلانے کی بجائے گنواروں کا جتھا اور اجڈوں کا گھڑمس کہلائے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسے افراد یا گروہ اشرف المخلوقات ہونے کی تعریف کی بالکل نفی کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ ان سے تو جنگل کے جانور بہتر ہیں۔

مشتاق نے بھی ایسے تہذیبی اور اخلاقی معاشرتی ابتذال کو نہ صرف مشاہدہ کیا ہے بلکہ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے اپنے بہت سے اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ اس تناظر میں مجھے ان کی یہ بات بہت متاثر کرتی ہے کہ وہ نہ تو بات کو فلسفیانہ موشگافیوں کا رنگ دیتے ہیں اور نہ ہی زہر کو قند یا غلطی اور خامی کو عذر کی پڑیوں میں لپیٹ کر حقائق کو مسخ کرتے ہوئے اپنا انسانی و شاعرانہ کردار داؤ پر لگاتے ہیں۔ ان کی شاعری پاکستانی معاشرتی حالات کا ایسا غیر جانبدارانہ منظر نامہ ہے جس کو پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے اس کا شاعر اس وطن کی گلی محلے میں عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے اور جس نے اس غیر مرتب معاشرتی فضا کو اپنے بدن پر یوں جھیلا ہے کہ اس کے تن بدن کا انگ انگ ان حالات کی گواہی بن گیا ہو۔ احتشام علی اس تناظر میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "احمد مشتاق نے مجموعہ اور گرد مہتاب کی غزلوں میں جلاوطنی کے کرب اور عصری آشوب کے بیانیے کو جتنے نتھرے ستھرے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا وہ پچھلی نصف صدی کی غزل میں محض انھی کا اختصاص ہے۔ ایک دکھ بھرے دل کے ساتھ اپنے عہد کی کہانی کو اتنی نفاست سے بیان کرنا کہ کسی نظریے یا آدرش کی ترویج کا شائبہ بھی نہ گزرے، ایک ایسا خالص انفرادی اور جمالیاتی مظہر ہے جو جدید اردو غزل کی روایت میں محض چند شاعروں کے حصے میں آیا ہے۔ ٹوٹتے ستاروں اور بہتے دریاؤں کے بیچ خاموشی کا تیشہ لیے اپنے داخلی کرب اور عصری آشوب کی اتنی نفیس صورت گری، ایک پر آہنگ عہد میں خالص شاعری کی ارفع مثال ہے۔"(۱۶)

فکر خلق خدا نہ خوف خدا
یہ کہاں کی خدا پرستی ہے
ارے کیوں ڈر رہے ہو جنگل سے
یہ کوئی آدمی کی بستی ہے(۱۷)

رزق ایسا حاوی محرک ہے جو انسانوں اور چرند پرند کو اپنا گھر بار، دوست احباب اور وطن تک چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے عام مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر لوگ اپنی زندگی کی گاڑی رواں دواں رکھنے اور بعض حالات میں خوب سے خوب تر کی تلاش اور خواہش لیے ہجرت اور مسافرت میں اپنی حیات کا بیشتر حصہ کاٹ دیتے ہیں۔ اپنوں کے فراق کا دکھ اور اپنی دھرتی سے جدا ہو کر جینے کا صدمہ کیا ہوتا ہے؟ حضرت یعقوب علیہ السّلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سوانح پڑھنے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

احمد مشتاق کا خیال ہے کہ کوئی بھی انسان ہو یا جانور وہ اپنے پیٹ کی اشتہا کو ایک مخصوص وقت تک ہی دبا سکتا ہے، لیکن بنیادی ضرورتوں کی آگ جب ایک بار بھڑک اٹھتی ہے تو پھر وہ سب کچھ جلا کر راکھ کیے بنا نہیں رکتی۔ شاعر نے حکومتی نمائندوں اور ریاستی کرتا دھرتاؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے سادہ، عام فہیم مگر علامتی رنگ میں عوام کے اس المیے کی روداد کو اس طرح شعر کے قالب میں ڈھالا ہے کہ وہ مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کی آواز بن گیا ہے۔

ہو گیا شہر پرندوں کی صدا سے خالی
پیٹ بھرتے ہیں کہیں آب و ہوا سے خالی (۱۸)

جب محافظ ہی چور اور رہبر ہی رہزن ٹھہریں تو ایسے حالات میں کسی معاشرے کو بربادی سے کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ہماری معاشرتی پسماندگی کی ایک بڑی اور اہم وجہ بھی فرائض کی یہی غفلت شعاری ہے جس میں ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھوتری دیکھنے میں آ رہی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ وطن عزیز کے شہریوں کو ابھی تک اپنی حدود و قیود اور خیر و شر کی بھی تمیز نہیں ہو پائی۔ ہمارے یہ غیر صحت مند رویے ایک طرف تو ہماری سماجی جڑوں کو کھوکھلا کیے جا رہے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے ملک کی عالمی برادری میں ساکھ بھی مجروح ہو رہی ہے۔ جس کے نتائج کا اندازہ فوری نہیں لگایا جا سکتا لیکن جب تک ہمیں اپنی عادات اور بے ترتیبی کا ادراک ہو گا بہت کچھ ہاتھ اور اختیار سے نکل چکا ہو گا۔

مشتاق نے اپنی طبیعت کی حساسیت کے سبب اس زوال خوردہ معاشرتی حالت اور ناگفتہ بہ فرائض شکنی کو ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے بھی یوں محسوس کیا ہے جیسے اس دگرگوں سماجی بے یقینی صورت حال سے وہ خود گزر رہے ہوں۔ مشتاق کے ایسے اشعار جہاں ایک خبر سے پردہ اٹھانے کا باعث بنتے ہیں وہیں پر ان کی حزنیہ لے شاعر کے داخلی جذبات کی عکاس ہے۔

دریچے کھل رہے ہیں شور برپا ہے مکانوں میں
سپاہی چوریاں کروا کے لوٹ آئے ہیں تھانوں میں (۱۹)

احمد مشتاق کے بعض اشعار پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اپنے کسی سابقہ واقعے کی روداد بیان کی ہو۔ اسی سبب ایسے اشعار پہلی ہی قرات میں دل و دماغ پر اپنے ایسے نقوش مرتب کر دیتے ہیں جن کا اثر ایک طویل عرصے تک قاری کے ذہن کے نہاں خانوں میں چٹکیاں کاٹتا اور اسے مضطرب رکھتا ہے۔

جن معاشروں میں احترام آدمیت سے زیادہ معاشی فوائد کو ترجیح دی جاتی ہو وہاں پھر عزت و احترام کا قاعدہ اور معیار بھی روپیہ پیسہ، گاڑی اور بنگلہ ہوا کرتا ہے۔ وہاں اچھے اور برے کھرے اور کھوٹے، زاہد اور گناہ گار کا فرق نہیں رہتا۔ وہاں خلوص، طلب، جستجو اور قربانیاں نہیں دیکھی جاتیں بلکہ اہمیت اور فضیلت کے سانچے بہت مصنوعی اور حریصانہ ہوتے ہیں۔

فٹ پاتھ پہ بھی سونے نہ دیا ترے شہر کے عزت داروں نے
ہم کتنی دور سے آئے تھے اک رات بسر کرنے کے لیے (۲۰)

مشتاق ایسے معاشرے کی حالت زار دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسی بستی میں رہنے اور ایسے بے مروت لوگوں سے امید خیر لگانے سے تو بہتر ہے کہ وہ کسی ویران و بیابان علاقوں میں اپنا مسکن بنا لیں۔ ان کا ماننا ہے کہ زاہد سا لوس قسم کے لوگوں میں رہ کر خود کو اذیت دینے اور دھوکے میں رکھنے سے تو بہتر ہے کہ انسان یہ سب چھوڑ چھاڑ کر ویرانوں میں نکل جائے۔ اس سے کم از کم داخلی گھٹن اور دوغلے لوگوں سے تو نجات مل جائے گی۔ اس ویرانے میں اگرچہ گنجان علاقوں جیسی سہولیات نہ سہی لیکن یہ نعمت بھی کیا کم ہے کہ وہ اپنے بہت سے معاملات میں آزاد و خود مختار ہو جائے اور اس کی سانسوں کو وہ آزادی نصیب ہو کہ جو اسے سب فکروں سے آزاد کر دے۔ ایسے اشعار معاشرتی نفسا نفسی اور کج ادائی کا کھلا اور واضح رد عمل ہیں، جس سے مشتاق کے کلام

کی حزنیہ لے کے اسباب سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

ایسی بستی سے تو اچھا ہے بیاباں اپنا
آدمی سانس تو لے سکتا ہے آسانی سے (۲۱)

غیر یقینی صورتحال اور معاشرتی بے راہ روی کا ستایا انسان آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے میں ہی عافیت ہے۔ اس طرح پل پل تڑپنے اور اذیت میں جان عذاب میں ڈالنے سے تو کچھ نہ کچھ جزوقتی ہی سہی بچت ہو سکتی ہے۔ مشتاق کے ہاں بھی یہی ڈھنگ ملتا ہے وہ جب اپنے وطن کے باسیوں کو مسلسل کرب ناکی میں مبتلا دیکھتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پوری پوری کوشش کریں گے کہ ایسے مقدوش حالات سے سب جانتے ہوئے بھی ان جان بنے رہیں اور اس بے یقینی و معاشرتی بے ترتیبی سے حتی الوسع صرف نظر کرنے کا کارن کریں۔ ساتھ ہی ان کا حساس دل انہیں تنبیہ کرنے والے استفہامیہ انداز میں ان سے کہتا ہے کہ تم آخر ایسا کب تک اور کیسے کر سکتے ہو؟ اس طرح ایک دم اجنبی بن جانے کے لیے جو بے مروتی اور بے حسی درکار ہے وہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے مزاج کا حصہ ہے۔

آنکھیں چرائیں درد جہاں سے کہاں تلک
حتی الوسع تو صرف نظر کر رہے ہیں ہم (۲۲)

المختصر یہ کہ احمد مشتاق کی غزل نہ صرف اپنے عہد کی نمائندگی کا حق ادا کرتی ہے بلکہ اپنے اسالیب اور شعریات کی وجہ سے اپنی الگ پہچان بنانے میں بھی سرخ رو ٹھہری ہے۔ جسے ان کے معاشرتی حالات کے ادراک اور احساس نے امرت رس عطا کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۹۱
۲۔ صباحت زہرا، پروفیسر، جدید اردو غزل کا موضوعاتی ارتقاء، دہلی: صبوحی پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۴۷
۳۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۹۲
۴۔ ایضاً، ص: ۱۰۷
۵۔ احمد مشتاق، اوراق خزانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص: ۱۷
۶۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۱۲۲
۷۔ انتظار حسین، دبیاچہ، مشمولہ، گرد مہتاب، لاہور: منظور پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۷
۸۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۱۲۶
۹۔ احمد مشتاق، اوراق خزانی، ص: ۲۳
۱۰۔ ضیا فاطمہ، ڈاکٹر، جدید اردو غزل، الہ آباد: کراؤن آفسیٹ پرنٹرس، ۱۹۹۵ء، ص: ۳۰۳
۱۱۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۱۳۷
۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۳۸
۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۴۴
۱۴۔ ناصر عباس نیر، کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پاتی، مشمولہ: آدمی ہمارا، مرتبہ: مشتاق احمد، لاہور: پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص: ۱۲۲
۱۵۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۱۵۵
۱۶۔ احتشام علی، احمد مشتاق کی غزل: جلاوطنی اور عصری آشوب کا اظہاریہ، مشمولہ: آدمی ہمارا، مرتبہ: مشتاق احمد، ص: ۲۰۶
۱۷۔ احمد مشتاق، اوراق خزانی، ص: ۱۴
۱۸۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص: ۱۹۶

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۹۹

۲۰۔ احمد مشتاق، اوراق خزانی، ص:۳۹

۲۱۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، ص:۲۲۵

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۵۱